نہج البلاغہ: اقدارِ بشریت و امنِ عالم کا سرچشمہ

پروفیسر سید علی رضا نقوی

انسانی معاشرہ ازل سے ایک ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے جو اقدارِ بشریت کے فروغ اور پُرامن اجتماعی زندگی کے فروغ کے لئے ممد و معاون ہو۔ وہ ایسے نظام کی جستجو میں اس وقت بھی تھا جب معاشرہ چند نفوس کا تھا، جہاں تک محدود تھا جب زندگی چند مسائل پر مشتمل تھی اور اس کی ضرورت عصرِ حاضر کے پیچیدہ دور میں بھی ہے جو ترقی یافتہ انسان کو بھی ہے جو تسخیرِ کائنات کا حوصلہ رکھتا ہے اور اپنے رب سے سوال کی جرأت کرتا ہے:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

(غالب)

لیکن عصرِ حاضر کا یہ ترقی یافتہ انسان تسخیرِ کائنات کا حوصلہ رکھنے اور "دشتِ امکاں" کو ایک "نقشِ پا" سمجھنے کے باوجود کچھ ایسا بے بس نظر آتا ہے کہ ایک پُرامن نظامِ حیات تشکیل دینے میں ناکام رہا ہے۔ اس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی روشنی میں جدید علوم و سائنسی ایجادوں کے ذریعے ایک خیر مشکل سی طرزِ زندگی تو حاصل کر لی لیکن کوئی ایسا دستورِ حیات مرتب کرنے میں بے بس نظر آتا ہے جو پورے انسانی معاشرہ کا ضامن بن سکے۔ نتیجتاً ایک غیر مستحکم طرزِ زندگی نے اقدارِ بشریت کو فروغ دینے کی بجائے ان کو متزلزل کر دیا۔ آج کی تمام تر ظاہری ترقی درحقیقت معنوں کو فنا و تباہی دے رہی ہے۔ حضرت علیؑ کا کلام جو آج دنیا کے سامنے نہج البلاغہ کی شکل میں موجود ہے، بھٹکی ہوئی انسانی فکر اور فکر سے محروم ذہنوں کی گمراہیوں میں گھری انسانیت کی آخری پناہ گاہ نظر آتا ہے جہاں اعلیٰ اخلاقی تعلیمات ہیں اور تشبیہ، ہدایت و نجات کے جھنڈے تلے صراطِ مستقیم کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی وہ کلام ہے جس پر اگر دنیا آج غور و خوض کرے، اس کو اپنا راہنما بنائے تو دنیا سے بھٹکی انسانی فکر کے لئے نئے انسانی معاشرہ کی تشکیل کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں اور اقدارِ بشریت کو عروج حاصل ہو جائے۔

انسان کا فطری نظامِ حیات

اس حقیقت کو مسلمہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان جُزوِ کائنات ہے اور مادّہ (جسم) و روح کا مرکب ہے۔ جُزوِ کائنات ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب کچھ انسان میں بھی ہے بلکہ شریکِ کائنات ہونے سے مُراد یہ بھی ہے کہ اجزائے کائنات کے آپسی ربط و ضبط میں جو تناسب و توازن پایا جاتا ہے وہی نظم و ضبط اور توازُن انسان کے اجزاء عناصر میں بھی ملتا ہے۔ انسان کائنات کا جُز ہے تو کائنات کی ہر خصوصیت اُس میں سموئی ہوئی ہے۔ اس لیے تا ابد انسان اپنی عقل و فہم کے مُطابق جو بھی انکشافات کرتا رہے گا وہ کائنات کے عناصر سے ہٹ کر نہیں ہوں گے۔

انسان مادّہ و روح کا مرکّب ہے اس لیے دونوں کی حیات و توانائی کے لیے مادّی و روحانی وسائل چاہئے، جن کے بغیر اُن کا فعال بنا رہنا ممکن نہیں ہے۔ اگر انسان کے جسم اور اُس کے اعضاء و جوارح کا یہ تقاضہ ہے کہ اچھی غذا، صحت مند آب و ہوا، رہائش، آرام دہ ملبوسات دستیاب رہیں تو روح کی تازگی، بالیدگی و صحتمندی کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان بلند کردار و اخلاق، منصفانہ فکر و عمل جائز و ناجائز کی تمیز، صبر و قناعت جیسے جوہروں سے بھی مزین رہے۔ ان دونوں کے متوازُن رہنے میں ہی حیاتِ انسانی کو بلند درجات ملتے ہیں۔ مزید، انسان کے روحانی جوہروں کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ مادّی تقاضوں کی پاسبانی کرتے ہیں۔ جب کبھی انسان اپنی نفسانی اور مادی ضرورتوں کی حدوں سے تجاوز کرتا ہے تو احساسِ گناہ، ضمیر کی ملامت، شرمندگی، پچھتاوا، صدمہ و افسوس جیسے احساسات اُس کی تنبیہہ کرتے رہتے ہیں۔ جب تک انسان کی نفسانی و مادی خواہشات روح کی نگہبانی کو قبول کرتی رہتی ہیں، جسم و روح کا توازُن برقرار رہتا ہے جو صحت مند انسانی معاشرہ کا ضامن بنتا ہے۔ ایسا ہی معاشرہ بشریت کے اعلیٰ اقدار کو فروغ دیتا ہے اور اُن کا تحفظ کرتا ہے لیکن جب انسان کی نفسانی و مادی خواہشات کی سرکشی روح پر حاوی ہوکر اُسکو اتنا آلودہ کردیتی ہے کہ انسان نہ اپنے ضمیر کی آواز سنے، نہ اُس کو شرمندگی و پچھتاوے کا احساس ہو، نہ اُس میں احساسِ گناہ باقی رہے، نہ کوئی جذبہ انصاف و رحم اُبھرے تو روح کی یہی مُردنی و بے حسی معاشرے کے عدم توازن اور اقدارِ بشریت کی پامالی کا سبب بن جاتی ہے۔ عصرِ حاضر کے انتشار و بدامنی کی بنیاد یہی غیر متوازن زندگی ہے۔

انسان کے مادّی وجود کی دو خصوصیات، جن کو ہم کمزوریاں کہہ سکتے ہیں، ایسی فطری، مستحکم اور بنیادی ہیں جن کو نہ دفن کیا جاسکتا ہے اور نہ دبایا جاسکتا ہے۔ اول، انسان لامتناہی خواہشات کا پلندہ ہے

جس کا سلسلہ پہلے سے آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ یہ خواہشات ایسی سرکش ہیں جن کے فسوں میں انسان ہر لمحہ گھرا رہتا ہے اور نتیجتاً طمع، حرص، حسد، نفرت، توہم پرستی، ہوس جیسے رُجحانات کا شکار بن جاتا ہے۔ دوم، انسان خودغرض بھی ہے جو اُس کو اپنی ذات کی تمام تر تسکین میں محصور رکھتی ہے اور نتیجتاً وہ ذخیرہ اندوزی، جمع خوری، منافع خوری، شقاوت، بے رحمی، بے حسی جیسے رُجحانات کی طرف مائل ہوجاتا ہے اور غیر منصفانہ نظامِ تقسیم میں ہی سکون کا احساس کرنے لگتا ہے۔ ان جذبوں کو تعلیم و تربیت و ترغیب کے ذریعہ شائستہ بنایا جاسکتا ہے، کسی حد تک کنٹرول بھی کیا جاسکتا ہے لیکن دبایا یا مٹایا نہیں جاسکتا۔ اسی مقام پر زندگی کے روحانی پہلوؤں کی اہمیت کا احساس اُبھرتا ہے جو ایسے منہ زور و سرکش جذبات میں توازن برقرار رکھنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ اگر ان جذبات کو روح کی نگہداشت و سرپرستی سے آزاد کردیا جائے، جیسا عصرِ حاضر کا معاشرہ کر رہا ہے، تو اقدارِ بشریت یقیناً پامال ہوجائیں گے اور معاشرہ امن و سکون سے محروم ہوتا چلا جائے گا۔ روح کی پاسبانی اُن میں نظم و ضبط، اعتدال و شائستگی قائم رکھتی ہے۔

دنیا کے نظام حیات

اب اس پس منظر میں اگر دُنیا کے مروجہ نظامِ معاشرت کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ انسانی کاوش نے اب تک دو نظامِ حیات مرتب کیے ہیں اور چونکہ دونوں انسانی کاوش کا نتیجہ ہیں اس لیے دونوں ہی انسان میں پائی جانے والی انہیں دو کمزوریوں پر ٹکے ہیں اور نتیجتاً پُرامن معاشرے کی تشکیل میں ناکامیاب ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظامِ حیات انسان کی لامتناہی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ ہوا دیتا نظر آتا ہے کیونکہ اُن کے مسلسل پھیلاؤ میں ہی نظام کا استحکام برقرار ہے۔ انسان کی خودغرضیوں کو بھی اس نظام میں خوب توانائی ملتی ہے۔ یہاں انسان کے جذبۂ آزادی کو بے لگام بنایا گیا تاکہ وہ حسبِ استعداد دولت و ثروت سمیٹتا رہے اور انسانوں کے جسمانی، ذہنی، نفسیاتی، طبیعی اور معاشرتی تفریق سے منہ موڑ کر، اُن کو پسِ پُشت ڈال کر، معاشرے کو عدم مساوات و استحصال کے کبھی نہ ٹوٹنے والے حِصار میں جکڑے رہنے کے لئے چھوڑ دے۔ ایسے نظام میں دولت مند و بااقتدار افراد کے اندر بے رحمی، شقاوت رعونت و بے حسی جیسے جذبات کا پنپنا فطری ہے کیونکہ یہی جذبات اُن کی خودغرضیوں کے محافظ بنتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اخلاقی پستیوں کی شکل میں سامنے ہے۔

ایسا معاشرہ مسابقت کی اندھا دُھند دوڑ میں جوجھ کر اپنے سے کمتر طبقہ کو حقیر و ذلیل اور پنے کو محترم سمجھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں کو مدِ مقابل ہوتے دیکھ کر ان کو پیچھے دھکیلنے کا ہر جائز و ناجائز

حربہ استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ ایسے معاشرہ کا انسان تو اپنے بزرگ والدین کی خدمت کو بھی تضیع اوقات سمجھنے لگتا ہے کیونکہ وہ اب اُس سسٹم کے کارآمد پُرزے نہیں رہے جن پر وقت و سرمایہ کھپایا جائے۔ انسان اپنی ذات کی خودغرضیوں میں اس قدر سمٹ جاتا ہے کہ اپنے بچوں کی سرپرستی و نگہداشت کو بھی وقت کی بربادی گردانتا ہے اور اس کے لیے ماہرین وخصوصی اداروں کی خدمات خرید کر فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہوجاتا ہے۔ ایسے ماحول کا پروردہ انسان ہمیشہ بہتر سے اعلیٰ کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے اور جو ذہنی، جسمانی، نفسیاتی اور معاشرتی اعتبار سے ایسا کرنے میں ناکام رہتے ہیں وہ استحصال کا شکار بنتے ہیں۔ وہ پھر ایسی ذہنی، و اخلاقی پستی کا شکار ہوتے ہیں کہ لاچاری و غربت میں ساہوکار کے ذریعہ دیئے گئے قرض کو اعلیٰ انسانی خدمت گردانتے ہیں، ساہوکار کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ برے وقت کام آیا اور وقت مقررہ پر رقم واپس کردینے کے عوض بطور ستائش سود کے چند روپیوں کو معاف کردینے کو عظیم کارِ خیر سمجھنے لگتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرے کے افراد بہ اعتبار اعضاء و جوارح، جذبات و احساسات، ذہنی استعداد اور طبیعت و مزاج مساوی نہیں ہوتے۔ اُن میں چاق و چوبند، ست و کاہل، مہم جو و محتاط، ضعیف و لاغر اور عقل مند و کند ذہن بھی ہوتے ہیں۔ نتیجتاً سبھی کی صلاحیتیں و استعداد برابر نہیں ہوتیں لیکن خواہشات وتمناؤں اور خودغرضی کا جذبہ ہر فرد میں موجود ہوتا ہے۔ اس تفریق کا لحاظ کیے بغیر بے لگام آزادی یقیناً مساوات کی پامالی کا سبب بنے گی۔

جان لیوا مقابلے، غیر عادلانہ رویہ، حق تلفی اور استحصال کو جھیلتے جھیلتے جب معاشرہ شدید انتشار و بدامنی کا شکار ہوا تو ایک شدید ردِعمل کے بطور اشتراکی نظامِ حیات پیدا کیا جس کی بنیادیں مساوات پر قائم کی گئیں۔ اشتراکی نظام، سرمایہ دارانہ نظام کا انتقامی عکس بن کر ابھرا، اُس کی ضد بنا اور ظاہر ہے جو نظام انتقام وضد پر قائم ہو وہ معاشرے کو انقلابی فکر کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ اس نظام نے بے لگام آزادی کو معاشرے کے انتشار و بدامنی کی جڑ قرار دیا اور نتیجتاً نظامِ حیات کو، بطور انتقام، دوسری مخالف انتہا کی طرف لے گیا جہاں انسان کے فطری جذبہ آزادی کو ہی مفقود مقید کرلیا گیا اور ''انفرادی آزادی'' کو ''اجتماعی آزادی'' اور ''انفرادی ملکیت'' کو ''اجتماعی ملکیت'' میں بدل دیا گیا۔

اس نظامِ حیات میں انسان کا اپنا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ پیدا ہوتا ہے تو جماعت کے لیے، محنت کرتا ہے تو جماعت کے لئے، کاوشوں وجستجوؤں میں سرکھپاتا ہے تو جماعت کے لیے، جیتا ہے تو جماعت کے لیے اور مرتا ہے تو جماعت کے لیے۔ اس طرح گویا وہ پیدا ہوتا ہے تو حکومت کا غلام بن کر جینے

کے لئے اور اپنے دست و بازو کی طاقت کو اسٹیٹ کا صدقہ سمجھنے کے لیے۔ اس نظام نے ''حبِّ ذات'' اور ''حبِّ نفس'' جیسے فطری جذبات کو اپنے پیدا کردہ ''حُبِّ جماعت'' جیسے جذبہ میں ضم کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے مخصوص تعلیم و تربیت، قہر و غلبہ کا راستہ اپنایا۔ اس نظام نے یہ فکر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ انسان کا ذاتی وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا، وہ جو کچھ بھی ہے، سماج کے جُز کے بطور اہمیت رکھتا ہے۔

یہ جذبہ کہ تم سماج کے لیے ہو یقیناً قابل قدر ہے لیکن یہ باور کرانا کہ تم کچھ بھی نہیں ہو، غیر فطری ہے۔ طاقت و جبر سے ہر بات منوائی جاسکتی ہے لیکن انسان کے جذبۂ آزادی اور ''حُبِّ نفس'' کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ ہاں تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس میں سلیقہ، وُسعت، جامعیت پیدا کی جاسکتی ہے لیکن فنا نہیں کیا جاسکتا۔ باوجود قہر و غلبہ، تشدد، تعلیم و تربیت کے اس معاشرہ کا پروردہ انسان تعجب کرتا رہا کہ میرے دست و بازو کی پیدا کی ہوئی اشیاء و خدمات پر اسٹیٹ کا تسلط کیوں ہے؟ اور اس کی محنت کی کمائی ہوئی دولت پر تصرّف کا اختیار اُسے کیوں نہیں ہے؟ اگر مساوات کی خاطر حکومت محنت و استعداد کے بموجب صلہ دینا طے کرلے تو انصاف کا تقاضہ یہ ہوگا کہ بہتر صلاحیتوں والے کا صلہ، کم صلاحیتوں والے کے مقابلہ زیادہ ہونا چاہئے کیونکہ مجموعی دولت میں اُن کا عطیہ مقابلتاً زیادہ ہے۔ اب اگر مساوات کی خاطر حکومت ضرورتوں کا تعین بھی خود کرنے لگے اور سب کو اُس کی طے کی ہوئی پیمائش کے مطابق برابر ملنے لگے تو یقیناً پیداوار میں زیادہ محنت کرنے والے افراد کی حق تلفی ہوگی۔ ان کا سوچنا ایک فطری بات ہوگی کہ وہ زیادہ پانے کے حقدار ہیں لیکن اُن کو جبراً اس حق سے محروم رکھا جارہا ہے چنانچہ تاریخ نے یہ ثابت کردیا کہ یہ مصنوعی و جبری مساوات معاشرہ کو منتشر ہونے سے نہیں بچاسکتی۔

دُنیا کا انسانی معاشرہ انہیں دو بڑے نظاموں پر مبنی ہے جس نے ایک طرزِ زندگی تو ضرور دی لیکن یہ دونوں نظام پُرامن معاشرے کی تشکیل اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ میں ناکامیاب رہے۔ نتیجتاً دونوں کو انتشار و بدامنی کا شکار ہونا پڑا۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں ہی نظام محض مادّی عناصر کے تانے، بانے سے حیاتِ انسانی کو سجانے سنوارنے پر مرکوز ہیں۔ مادّی عناصر سے ہٹ کر، انسان کے اخلاق، کردار، نیک و بداعمال، قناعت، صبر، حق گوئی، عدل و انصاف ہمدردی جو روح کی توانائی کے مظہر ہیں، اُن کو نہ کوئی اہمیت دی گئی اور نہ حیاتِ انسانی کے دستورِ عمل کا حصہ بناکر نظامِ کی کامیابیوں و ناکامیابیوں کے پرکھنے کی کسوٹی بنایا گیا۔

یوں تو عدل و انصاف، مساوات، فلاح و بہبود، امداد، رعایت کے بہت سے نظریات ان نظاموں میں مل جائیں گے لیکن غور کیجئے تو وہ آفاقی نظریات سے زیادہ محض ایک مخصوص زاویہ فکر کی تبلیغ کے

آلۂ کار کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ انسان آج باوجود مادّی ترقی و آسودگیوں کے عروج کے، ذہنی انتشار، فکری کشمکش اور بدامنی کا شکار ہے اور ایک آفاقی، صلح اور عدل و انصاف پر مبنی طرزِ معاشرت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ دنیاوی نظاموں کے فکروعمل نے واضح کردیا کہ وہ انسان کے فطری جذبات یعنی خواہشات، تمنائیں، خودغرضیاں اور آزادی کو نہ کوئی صحیح سمت دے سکے اور نہ اس کی نگہداشت کرسکے۔ اگر وہ ان فطری جذبات کو اپنے نظریوں کی تبلیغ کا آلۂ کار بنانے کے بجائے، راہِ نما بنالیتے اور انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اُترنے کا ذریعہ بناتے تو بہت ممکن تھا کہ ایک پُرامن انسانی معاشرے کی تشکیل میں کامیاب ہوجاتے۔

نہج البلاغہ: دائمی دستورِ حیات اور اعلیٰ اقدارِ بشریت کا سرچشمہ

نہج البلاغہ کے خطبات، وعظ و نصیحتیں، خطوط، اقوالِ انسانی فطرت اور نفسیات کی گہرائیوں میں اُتر کر انسان کی انہیں دو کمزوریوں کا محاسبہ کر رہے ہیں۔ حقیقتوں سے آگاہی، انتباہی طرزِ تخاطب نصیحتیں، نفسیاتی حربے، ماضی کی تاریخ اور فکر وعمل کی تعلیم کے ذریعہ آگاہ کیا جارہا ہے کہ دنیا کے مائل بہ فنا عناصر، اُن کی کشش، دنیا کی بے ثباتی، بے رحمی و بے رُخی اور اُسکی تمام حشر سامانیوں سے قلیل مدت کی زندگی کو محفوظ رکھتے ہوئے کس طرح باوقار و پُرامن زندگی گزار سکتا ہے اور یہ تعلیم اس لیے دی جارہی ہے کہ انسان اگر ہوس و خواہشات کا پتلا ہے، مفاد پرست اور خودغرض ہے، اس کے پیش نظر غیر دائمی مادّی لذت و راحت ہے، وہ ذاتی مفاد و مصلحت کو معیار بناتا ہے اور اسی کے تحت جدوجہد کرتا ہے تو دوسری طرف وہ صاحبِ عقل وفہم بھی ہے۔ اُس کے پاس روح بھی ہے جو اُس کے جذبات کی پاسبانی کرتی ہے۔ اس لیے جذبات و خیالات کو عقل وفہم کی کسوٹی پر پرکھنے کی طرف موڑ دیا جائے اور اس کے لئے روحانی عناصر کو توانا بنائے رکھا جائے تو یہی مستحکم دستورِ حیات مرتب کرنے کی بنیاد ہوگی جو پُرامن معاشرہ کی تشکیل کرے گا اور جہاں اعلیٰ انسانی اقدار نہ صرف فروغ پائیں گے بلکہ ان کا تحفظ بھی ہوگا۔

اسلام نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر، تمام تر تفصیلات کے ساتھ، واضح کیا ہے کہ انسان خودغرض، حوس پرست اور لامتناہی خواہشات کا پُتلا ہے۔ ان جذبات کو فطری تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیے نہ اُن کو روکا جاسکتا ہے نہ دبایا جاسکتا ہے اور نہ مٹایا جاسکتا ہے لیکن اُن کو آزاد بھی نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ اُن کی یہی آزادی معاشرے کے انتشار اور بدامنی کا سبب

ہوتی ہے۔ اس کا واحد حل یہی ہے کہ اُن کو روحانی افکار و اخلاقی اقدار کی مکمل سرکردگی و سرپرستی میں رکھنے کی تاکید کی جائے تاکہ اُن کی سرکشی پر انکش لگا رہے۔

انسانی معاشرہ ذہنی سوجھ، بوجھ، احساسات، طبیعت و طینت، جسمانی طاقت اور رجحانات کے اعتبار سے مختلف درجات میں بٹے ہونے کے باوجود، خواہشات، امیدوں تمناؤں اور خودغرضیوں کے لحاظ سے مساوی ہیں۔ اس لیے ان میں بکھراؤ ٹکراؤ اور تضاد کا پایا جانا فطری ہے جس کا پورا فائدہ دنیاوی نظاموں نے اُٹھایا اور انسانی معاشرے کو محض مادی عناصر کا اسیر بنا کر پرامن معاشرے کا خواب دیکھا۔ یقیناً یہ ناقص اور ادھوری کوشش ہے۔ نہج البلاغہ میں ان مادّی و ظاہری عناصر کی بے لگام گرویدگی کی تباہ کاریوں سے انسان کو متنبہ کیا جارہا ہے اور اُن کو باطنی قوتوں کے زیرِ نگر رکھنے کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ اُن کی سرکشی معاشرہ کی تباہی کا سبب نہ بننے پائے۔

نہج البلاغہ میں فانی دنیا کی حقیقتوں کا آئینہ دکھلا کر انسان کی عقل وفہم کو جگائے رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ وہ غور وفکر کے ذریعہ محتاط و متوازن رُخ اختیار کرے۔ نہج البلاغہ کے خطبات، نصیحتیں، وعظ وخطوط قدم قدم پر انسانی معاشرہ کے بکھراؤ، ٹکراؤ اور تضاد کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کے بچاؤ اور تحفظ کا راستہ بھی بتلا رہے ہیں۔ یہاں عالم انسانیت کو ایک لڑی میں پروتے ہوئے ایسے بلند ترین نقطہ کی طرف لے جایا جارہا ہے جس کے پرے انسانی عقل وفہم بے معنی ہوجاتی ہے۔ یہ بلند ترین نقطہ عالم بشریت کی بکھری و متضاد فکر کو متحد کرنے کا واحد مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ اسی نقطۂ اتحاد کا نام "توحید" ہے۔

اگر ہر انسان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوجائے کہ اس کائنات کا خالق ایک ہے، سب اُس خالق کے بندے ہیں، ہماری زندگی اور موت اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ ہمارے ہر ارادے، ہر نیت اور ہر عمل سے آگاہ ہے اور ہم کو اسی کے بموجب سزا و جزا دیتا ہے تو انسانوں کے درمیان سرکشانہ آزادی کے جذبہ پر انکش لگ جائے گا۔ پھر انسانوں کے درمیان ہر طرح کی تفریق کا جذبہ مٹ جائے گا اور یہی ذہنی ہم آہنگی معاشرے میں عدل و انصاف و مساوات کی بنیاد بنے گی۔

دوسری طرف اگر دُنیا کی بے ثباتی، بے رُخی، بے رحمی کا یقین ہوجائے، جیسا خطبات میں تمام تر نفسیاتی حربوں کے ساتھ انسانی ذہن کو جھنجھوڑا گیا ہے، تو پھر انسان دُنیا کو ایک "امتحان گاہ" اور "گزرگاہ" سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا۔ دنیا کو محض "امتحان گاہ" اور "گزرگاہ" سمجھنے کا یقین اس بات کا اعتراف ہوگا کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے جس کی گرویدگی منافع بخش نہیں ہے۔ اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک دائمی زندگی کی طرف جانا ہے جہاں فانی دنیا کے فانی عناصر ساتھ نہیں دے سکتے۔

ہاں اس فانی دنیا سے اس دائمی دنیا کے لئے جو زادِ راہ ہیں وہ اس کے اعمالِ صالحہ ہیں جو دونوں دنیاؤں میں لافانی زندگی کی ضمانت بنتے ہیں۔ یہی یقین کامل دنیا کے عیش و طرب میں ملوث رہنے سے اسے روکتا ہے۔ اس کو حد سے تجاوز نہ کرنے اور اُن کا غلام نہ بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر دولت و ثروت سمیٹنے سے زیادہ تقسیم کا رُجحان تقویت پاتا ہے جو فلاحِ عام کا ذریعہ، مساوات کا سرچشمہ اور عدل و انصاف کا منبع بنتا ہے۔ یہی قناعت، توکل اور تطہیرِ نفس بے لگام خواہشات، تمناؤں، خودغرضیوں کو راہِ راست پر قائم رکھنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

حضرت علیؑ نے اپنے خطبات، نصیحتوں، خطوط و تحریروں میں اس بات پر مختلف نوعیتوں سے زور دیا ہے کہ انسان کی بلندی، وقار اور شرف خواہشات کے ساتھ بہہ جانے میں نہیں بلکہ اعلیٰ قدروں کے لیے سعی و کوشش اور بلند مقصد کے لیے جدوجہد میں مضمر ہے۔ یہی تطہیرِ نفس اختیارات پر قابو پانا سکھاتی ہے اور یہی اختیارات پر قابو پالینا اصل آزادی ہے۔ یہ وہ راہ ہے جہاں انسانی تہذیب و معاشرت کا آغاز بندگی، ایمان و یقین سے ہوتا ہے اور نتیجہ میں انسان کُلیہ پابندیوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا:

"اسلام سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور سرِ تسلیم جھکانا یقین ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق اعترافِ فرض کی بجا آوری ہے اور فرض کی بجا آوری عمل ہے..... جو عمل میں کوتاہی کرتا ہے وہ رنج و اندوہ میں مبتلا ہوتا ہے....."۔

پھر ایک خطبہ میں آگاہ کیا:

"اے لوگو! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرے اُمیدوں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاؤ آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے اُس سے اتنا زادِ راہ لو جس سے کل اپنے نفسوں کو بچا سکو"۔

انسان چاہے جتنا صاحبِ دولت و ثروت والا ہوجائے، چاہے جتنی طاقت و قوت سمیٹ لے، چاہے جتنا صاحبِ اقتدار بن جائے وہ اپنی ہر خواہش، ہر آرزو اور ہر تمنا پوری کرنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اگر انسان صاحبِ عقل و فہم ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کر لے گا۔ کسی شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ نے خُدا کو کیسے پہچانا تو فرمایا: "میں نے خدا کو پہچانا ارادوں کے ٹوٹ جانے سے، نیتوں کے بدل جانے سے اور ہمتوں کے پست ہوجانے سے پھر فرمایا اللہ کی عظمت کا احساس کرو تاکہ تمہاری نظروں میں کائنات حقیر و پست ہوجائے"۔ انسانی جدوجہد کا سفر، ابھی اس عظمت کے

احساس کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہا ہے لیکن یقین ہے تسخیرِ کائنات خُدا کی عظمت کا احساس کرا کر اُس کو حقیر و پست ضرور کرے گی۔ جو لوگ دنیا کی بے ثباتی، بے رُخی اور اپنے آخری انجام سے بے خبر مادی، عیش و طرب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اُسی کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں وہ ''ایسے سواروں کے مانند ہیں جو سو رہے ہیں اور سفر جاری ہے''۔

انسانوں کے ذہنوں سے غفلت کا پردہ یوں اُٹھایا جا رہا ہے:

''میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں اس لیے کہ یہ بظاہر شیریں و خوش گوار، تر و تازہ و شاداب ہے۔ نفسانی خواہشیں اُس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ جلد میسر آ جانے والی نعمتوں کی وجہ سے لوگوں کو محبوب ہے اور اپنی تھوڑی سی آرائشوں سے مشتاق بنا لیتی ہے''۔

لیکن ''وہ جھوٹی امیدوں سے سجی ہوئی ہے اور دھوکے اور فریب سے بنی سنوری ہے۔ نہ اُس کی مسرتیں دیرپا ہیں اور نہ اُس کی ناگہانی مصیبتوں سے مطمئن رہا جا سکتا ہے۔ جو شخص اس دنیا کا عیش و آرام پاتا ہے تو اس کے بعد اُس کے آنسو بھی بہتے ہیں اور جو شخص دنیا کی مسرتوں کا رخ دیکھتا ہے تو وہ مصیبتوں میں دھکیل کر اُس کو اپنی بے رخی بھی دکھلاتی ہے اور جس شخص پر راحت کے ہلکے ہلکے چھینٹے ڈالتی ہے، اس پر مصیبت و بلا کی دھواں دھار بارش بھی کرتی ہے..... اس کے کسی زاد راہ میں، سوائے تقویٰ کے بھلائی نہیں۔ جو شخص کم لیتا ہے، راحت کے سامان بڑھا لیتا ہے اور جو دنیا کو زیادہ سمیٹتا ہے وہ اپنے لیے تباہ کُن چیزوں کا اضافہ کر لیتا ہے''۔

پھر مشاہدات و ماضی کی تاریخ کا آئینہ دکھلا کر یوں فرمایا:

''کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنھوں نے دنیا پر بھروسہ کیا اور اُس نے انہیں مصیبتوں میں ڈال دیا اور کتنے ہی اُس پر اطمینان کیے بیٹھے تھے جنھیں اُس نے پچھاڑ دیا اور کتنے ہی رعب و طنطنہ والے تھے جنھیں حقیر و پست بنا دیا اور کتنے نخوت و غرور والے تھے جنھیں ذلیل کر کے چھوڑا۔ اُس کی بادشاہی دست بدست منتقل ہونے والی ہے۔ اس کی سلطنت چھن جانے والی۔ اُس کا زبردست زیردست بننے والا، مال دار بدبختوں کا ستایا ہوا ہے۔

کیا تم انہیں سابقہ لوگوں کے گھروں میں نہیں بستے جو لمبی عمروں والے اور بڑے بڑے لاؤ لشکر والے تھے، وہ دنیا کی کس کس طرح پرستش کرتے رہے اور اُسے آخرت پر کیسا، کیسا ترجیح دیتے رہے۔ پھر کسی ایسے زادِ و راحلہ کے جو انہیں راستہ طے کر کے منزل تک پہنچائے چل دیئے، کیا تمہیں کبھی یہ خبر پہنچی ہے کہ دنیا نے ان کے بدلے میں کسی فدیہ کی پیشکش کی ہو یا انھیں کوئی مدد پہنچائی ہو

یا اچھی طرح اُن کے ساتھ رہی ہو..... تم نے دیکھا کہ جو ذرا دنیا کی طرف جھکا اور اُسے اختیار کیا اور اُس سے لپٹا تو اس نے اپنے تیور بدل کر اُن سے کیسی اجنبیت اختیار کرلی اور یہاں تک وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہوکر چل دیئے اور اُس نے بھوک کے سوا کچھ زادِ راہ نہ دی اور ایک تنگ جگہ کے سوا کوئی ٹھہرنے کا سامان نہ کیا اور سوائے گھُپ اندھیرے کے کوئی روشنی نہ دی اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ دیا''۔

پھر سوال کیا: ''تو کیا تم اسی دنیا کو ترجیح دیتے ہو یا اُس پر مطمئن ہوگئے ہو..... اُن لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو کہا کرتے تھے کہ ''ہم سے زیادہ قوت و طاقت میں کون ہے''۔ انہیں لاد کر قبروں تک پہنچایا گیا۔ اس طرح نہیں کہ اُنہیں سوار سمجھا جائے، انہیں قبروں میں اتار دیا گیا مگر وہ مہمان نہیں کہلائے، پتھروں سے اُن کی قبریں چن دی گئیں اور خاک کے کفن اُن پر ڈال دیئے گئے اور گلی سڑی ہڈیوں کو اُن کا ہمسایہ بنادیا گیا..... وہ بردبار بنے خاموش و بے خبر پڑے ہیں۔ اُن کے بغض و عناختم ہوگئے اور کیسے مٹ گئے۔ نہ اُن سے کسی ضرر کا اندیشہ ہے، نہ کسی تکلیف کے دور کرنے کی توقع ہے۔ جس طرح ننگے پیر و ننگے بدن پیدا ہوئے تھے ویسے ہی زمین میں پیوندِ خاک ہوگئے.....''۔

دنیا میں رہ کر انسان کس طرح کے مختلف و متضاد جذبات کا شکار رہتا ہے اس کی تصویر کشی دیکھئے۔ ان انکشافات کے آگے انسان کی طمع اور اُس کے غرور و تکبر کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ انسان اگر اس کا احساس کرلے تو یقیناً میانہ روی و اعتدال پسندی کو ہی اپنا شعار بنالے گا:

''اگر اُسے امید کی جھلک نظر آتی ہے تو طمع ذلت میں مبتلا کردیتی ہے اور طمع اُبھرتی ہے تو حرص تباہ و برباد کردیتی ہے۔ اگر نا امیدی اُس پر چھا جاتی ہے تو حسرت و اندوہ اُس کے لیے جان لیوا بن جاتے ہیں اور اگر اس پر غضب طاری ہوتا ہے تو غم و غصہ شدت اختیار کرلیتا ہے اور اگر خوش و خوشنود نظر آتا ہے تو حفظِ ماتقدم بھول جاتا ہے اور اگر اچانک اس پر خوف طاری ہوتا ہے تو فکر و اندیشہ دوسرے قسم کے تصورات سے روک دیتا ہے۔ اگر امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے تو غفلت اس پر قبضہ کرلیتی ہے اور اگر مال و دولت حاصل کرلیتا ہے تو دولتمندی اسے سرکش بنادیتی ہے اور اگر فقر و فاقہ کی تکلیف میں مبتلا ہو تو مصیبت اسے جکڑ لیتی ہے اور اگر بھوک اس پر غلبہ کرتی ہے تو ناتوانی اٹھنے نہیں دیتی اور اگر شکم پُری بڑھ جاتی ہے تو اذیت کا باعث ہوتی ہے۔ ہر کوتاہی اس کے لیے نقصان رساں اور حد سے زیادہ تباہ کن ہوتی ہے''۔

دنیا کی حقیقتوں کا آئینہ دکھلا کر بنی نوع انسانی کے عقل و فہم کو اس طرح جلا بخشی جارہی ہے: ''عقل

سے بڑھ کر کوئی مال سودمند نہیں اور خود بینی سے بڑھ کر کوئی تنہائی وحشتناک نہیں اور تدبیر سے بڑھ کر کوئی عقل کی بات نہیں اور کوئی بزرگی تقویٰ کے مثل نہیں اور خوش خلقی سے بڑھ کر کوئی ساتھی نہیں اور ادب کے مانند کوئی میراث نہیں۔ توفیق سے بڑھ کر کوئی پیشرو اور اعمال سے بڑھ کر کوئی تجارت نہیں..... تفکر و پیش بینی سے بڑھ کر کوئی علم نہیں اور ادائے فرائض کے مانند کوئی عبادت اور حیا و صبر سے بڑھ کر کوئی ایمان نہیں..... علم سے بڑھ کر کوئی عزت اور مشورہ سے مضبوط کوئی پشت پناہ نہیں"۔

حضرت علیؑ کمیل ابن زیاد نخعی کو تعلیم دے رہے ہیں:

"اے کمیل یاد رکھو! علم مال سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری نگہداشت کرتا ہے جبکہ مال کی حفاظت تمہیں کرنی پڑتی ہے۔ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے جب کہ علم صرف کرنے سے بڑھتا ہے۔ مال و دولت کے نتائج و اثرات مال کے فنا ہوجانے پر فنا ہوجاتے ہیں، علم کی شناسائی ایک دین ہے کہ اس سے انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے اپنی اطاعت منواتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے۔ یاد رکھو علم حاکم ہے اور مال محکوم۔ اے کمیل! مال اکٹھا کرنے والے زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہوتے ہیں اور علم حاصل کرنے والے رہتی دنیا تک باقی رہتے ہیں"۔

اب دستورِ حیات و معاشرتی اقدار کی تلقین اس طرح کی جارہی ہے۔ اپنے فرزند امام حسنؑ کو یوں تعلیم دے رہے ہیں:

"اے فرزند! میں نے تمہیں دنیا اور اُس کی حالت اور اُس کی بے ثباتی و ناپائیداری سے خبردار کردیا ہے اور آخرت والوں کے لیے جو سروسامانِ عشرت مہیا ہے اس سے بھی آگاہ کردیا"۔

اے فرزند! اپنے اور دوسرے کے درمیان ہر معاملہ میں اپنی ذات کو میزان قرار دو، جو اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو اور جو اپنے لیے نہیں چاہتے اُسے دوسروں کے لیے بھی نہ چاہو۔ جس طرح یہ چاہتے ہو کہ تم پر زیادتی نہ ہو، یوں ہی دوسروں پر بھی زیادتی نہ کرو اور جس طرح یہ چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ حُسن سلوک ہو، یوں ہی دوسروں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ..... دوسروں کے لیے وہ بات نہ کہو جو اپنے لیے سننا گوارہ نہیں کرتے"۔

"یاد رکھو! خود پسندی صحیح طریقہ کار کے خلاف اور عقل کی تباہی کا سبب ہے۔ روزی کمانے میں دوڑ دھوپ کرو اور دوسرے کے خزانچی نہ بنو..... دیکھو تمہارے سامنے ایک دشوار گزار اور دور دراز راستہ ہے جس کے لیے بہترین زاد کی تلاش اور بقدرِ کفایت توشہ فراہمی، سبکباری ضروری ہے۔ لہٰذا اپنی طاقت سے زیادہ اپنی پیٹھ پر بوجھ نہ لادو۔ تمہارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جس میں ہلکا

پھلکا آدمی گراں بار آدمی سے کہیں اچھی حالت میں ہوگا.....''۔

''جو زیادہ بولتا ہے وہ بے معنی باتیں کرنے لگتا ہے۔ سوچ وچار سے قدم اُٹھانے والا صحیح راستہ دیکھ لیتا ہے۔ نیکوں سے میل جول رکھو گے تو تم بھی نیک ہوجاؤ گے، بروں سے بچے رہوگے تو ان کے اثرات سے بھی محفوظ رہو گے۔ جہاں نرمی سے کام لینا نامناسب ہو وہاں سخت گیری ہی نرمی ہے۔ کبھی کبھی دوا بیماری اور بیماری دوا بن جاتی ہے..... کبھی کبھی بدخواہ بھلائی کی راہ سوجھا دیا کرتا ہے اور دوست فریب دے جاتا ہے..... تجربوں کو محفوظ رکھنا عقلمندی ہے۔ بہترین تجربہ وہ ہے جو نصیحت دے.....''۔

''جب تک زمانہ کی سواری تمہارے قابو میں رہے، نباہ کرتے رہو۔ زیادہ کی امید میں اپنے کو خطروں میں نہ ڈالو، خبردار کہیں دشمنی وعناد کی سواریاں تم سے منھ زوری نہ کرنے لگیں.....''۔

''اپنے کو اپنے بھائی کے لیے اس پر آمادہ کرو کہ جب وہ دوستی توڑے تو تم اُسے جوڑو، وہ منھ پھیرے تو تم آگے بڑھو اور لطف و مہربانی سے پیش آؤ ..... وہ دوری اختیار کرے تو تم اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرو۔ وہ سختی کرتا رہے اور تم نرمی کرو..... مگر خبردار یہ برتاؤ بے محل نہ ہو اور نا اہل سے یہ رویہ اختیار نہ کرو۔ اپنے کسی دوست سے تعلقات قطع کرنا چاہو تو اپنے دل میں اتنی گنجائش رکھو کہ اگر اس کا رویہ بدلے تو اس کے لیے جگہ ہو''۔

''اے فرزند! یقین رکھو رزق دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کی تم جستجو کرتے ہو اور ایک وہ جو تمہاری جستجو میں ہے۔ اگر تم اُس کی طرف نہ بھی جاؤ تو وہ تم تک آ کے رہے گا۔ ضرورت پڑنے پر گڑگڑانا اور مطلب نکل جانے پر کج خلقی سے پیش آنا انتہائی بری عادت ہے۔ دنیا سے بس اتنا ہی اپنا سمجھو جس سے اپنی عقبیٰ کی منزل سنوار سکو۔ ٹوٹ پڑنے والے غم اور اندوہ کو صبر کی پختگی اور حُسن یقین سے دور کرو۔ جو درمیانی راستہ چھوڑ دیتا ہے وہ بے راہ ہوجاتا ہے۔ جو اپنی حیثیت سے آگے نہیں بڑھتا، اُس کی منزلت برقرار رہتی ہے''۔

پھر اپنے فرزند کو چار باتوں کی نصیحت کرکے گویا منشور حیات کا نچوڑ یوں پیش کیا:

''چار باتیں یاد رکھو۔ اُن کے ہوتے ہوئے جو کچھ کرو گے وہ تمہیں ضرر نہ پہنچائے گا۔ سب سے بڑی ثروت عقل و دانش ہے اور سب سے بڑی ناداری حماقت و بدعقلی ہے اور سب سے بڑی وحشت غرور وخود بینی ہے اور سب سے بڑا جوہر ذاتی حُسن اخلاق ہے''۔

اس حُسنِ سلوک کی وضاحت یوں کی: ''لوگوں سے اس طرح ملو کہ اگر مرجاؤ تو تم پر روئیں اور زندہ رہو تو تمہارے مشتاق رہیں''۔ پھر فرمایا: ''جو شخص اپنے قبیلے کی اعانت سے ہاتھ روک لیتا ہے تو

اس کا تو ایک ہاتھ رکتا ہے لیکن وقت پڑنے پر بہت سے ہاتھ اُس کی مدد کو رُک جاتے ہیں۔ اس لیے ''دوسروں کے پسماندگی سے بھلائی کرو تا کہ تمہارے پسماندگان پر بھی شفقت پڑے''۔

پھر حسن سلوک کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: ''انصاف سے دوستوں میں اضافہ ہوتا ہے، لطف و کرم سے قدر و منزلت بڑھتی ہے، جھک کے ملنے سے نعمت تمام ہوتی ہے۔ دوسروں کا بوجھ بٹانے سے سرداری حاصل ہوتی ہے اور خوش گفتاری سے کینہ دور اور دشمن مغلوب ہوتا ہے اور سر پھرے آدمی کے مقابلہ بردباری سے اُس کے مقابلہ اپنے طرفدار زیادہ ہوجاتے ہیں''۔

انسانی معاشرے کا امن وسکون اور اعلیٰ اقدار کی نشو ونما و ان کا فروغ محض اس پر منحصر نہیں ہوتا کہ عوام کے کردار و اخلاق کو سنوارا جائے بلکہ حاکم کے کردار و اخلاق کے معیار بھی اسی قدر اہم ہیں۔ نہج البلاغہ کے مختلف خطبات و مکتوب حاکم کے معیار کو طے کر رہے ہیں۔ مالک اشتر کو مصر و اطراف کی حکومت سپرد کرتے وقت ایک طویل عہد نامہ حکومت کا دستورِ اساسی ہے جس میں حکومت کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتے ہوئے حاکم کے فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ عہدنامہ کافی طویل ہے جس کے حوالے و تشریح سے، مضمون کی کوتاہ دامنی کا لحاظ رکھتے ہوئے گریز کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دیگر خطبات میں بھی حکومت کے دستور واضح کیے گئے ہیں۔ مثلاً ''محمد ابنِ ابی بکر کو جب مصر کی حکومت سپرد کی تو ہدایت دی: ''لوگوں سے تواضع کے ساتھ ملنا، اُن سے نرمی کا برتاؤ کرنا، کشادہ روی سے پیش آنا اور سب کو ایک نظر سے دیکھنا تا کہ بڑے لوگ تم سے اپنی ناحق طرفداری کی امید نہ رکھیں اور چھوٹے لوگ عدل و انصاف سے نا امید نہ ہوں۔ کیونکہ اے اللہ کے بندو! اللہ تمہارے چھوٹے، بڑے، کھلے، ڈھکے اعمال کی تم سے باز پرس کرے گا اور اُس کے بعد اگر وہ عذاب کرے تو یہ تمہارے خود ظلم کا نتیجہ ہے اور اگر وہ معاف کردے تو وہ اس کے کرم کا تقاضہ ہے''۔

حکمراں کے رعیت پر اور رعیت کے حکمراں پر کیا فرائض ہیں، صفین کے موقعہ پر ایک خطبہ میں یوں واضح کیے: ''.....چنانچہ رعیت اُسی وقت خوش حال رہ سکتی ہے جب حاکم کے طور طریقے درست ہوں اور حاکم بھی اسی وقت صلاح و درستگی سے آراستہ ہوسکتا ہے جب رعیت اُس کی انجام دہی کیلیے آمادہ ہو۔ جب رعیت فرمانروا کے حقوق پورے کرے اور فرمانروا رعیت کے حقوق سے عہدہ برا ہو تو اُن میں حق باوقار، دین کی راہیں استوار اور عدل و انصاف کے نشانات برقرار ہوجائیں گے..... اور زمانہ سدھر جائے گا''۔

''اور جب رعیت حاکم پر مسلط ہوجائے یا حاکم رعیت پر ظلم ڈھانے لگے تو اس موقعہ پر ہر بات میں اختلاف ہوگا۔ ظلم کے نشانات ابھر آئیں گے۔ دین میں مفسد بڑھ جائیں گے..... خواہشوں پر عمل

درآمد ہوگا..... نفسانی بیماریاں بڑھ جائیں گی اور بڑے سے بڑے حق کو ٹھکرا دینے اور بڑے سے بڑے باطل پر عمل پیرا ہونے سے بھی کوئی نہ گھبرائے گا۔ ایسے موقعہ پر نیکوکار ذلیل اور بدکردار باعزت ہوجاتے ہیں"۔

نہج البلاغہ میں دستورِ حیات اور اقدار بشریت کو قانونِ قدرت سے بندھے افاقی قوانین، ٹھوس و مدلل عقائد، فطرت و عقل و دانش کے حصار میں رکھ کر واضح کیا گیا ہے۔ یہاں بنی نوع انسانی کے لیے ایسا معتدل، متوازن اور دائمی نظام حیات پیش کیا گیا ہے جو اسی معاشرے کے پُرامن، پروقار اور بلند معیار زندگی کا ضامن ہے۔ نہج البلاغہ میں حیات انسانی کے دو اہم پہلوؤں کو دستورِ حیات کی بنیاد بنایا گیا۔ اول واقعیت (فطرت) اور دوسرا اخلاقیات۔ واقعیت سے مراد ایسے مقاصد حاصل کرنا ہے جو انسانی فطرت و ضمیر کے عین مطابق ہوں۔ فطری خواہشات کو عقل کی پاسبانی میں دے کر اور ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر جو مقصد حاصل کیا جائے گا وہی مستحسن ہوگا۔ نہج البلاغہ میں فطری خواہشات کو نہ دبایا گیا نہ روکا گیا اور نہ اُن کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا بلکہ اُن کے بھڑکنے اور وسیع ہونے کو دنیا کے مائل بہ فنا مادّی وسائل، اُن کی تمام تر سرکشی، بے ثباتی اور بے رخی کا آئینہ دکھلا کر عقل و دانش کے ذریعہ نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ اخلاقیات کی بنیاد عقل و دانش کی سرکردگی میں عمل پیرا ہونے پر ٹکی ہے۔ اسی سرکردگی سے منہ موڑنے کا انجام بے لگام آزادی، بے راہ روی اور نتیجہ میں بے امنی ہے۔ دنیا کے نظامِ حیات انسانی کے مادّی پیکر میں محصور ہے اور اس کو متوازن رکھنے والے روحانی پیکر کو نظر انداز کردیا۔ نتیجتاً انسان کے ضمیر و اخلاق جیسے جذبوں کو کوئی قدر و منزلت نہ ملی۔ قدرت نے ان جذبوں کو مادّی و نفسانی جذبوں کی سرکشی کی نگہداشت کے لیے پیدا کیا۔ اس لئے ایک صالح، متوازن نظامِ حیات تو اسی وقت تشکیل پاسکتا ہے جب دونوں کو متوازن رکھا جائے۔ یعنی جہاں زندگی نہ اتنی آزاد ہو کہ بے راہ روی کی ڈگر پر بے لگام بڑھنے لگے اور امن و سکون کو خطرہ پیدا ہوجائے اور نہ احکاموں کی زنجیروں میں ایسی جکڑی بندھی ہو کہ گھٹن کا احساس پیدا ہوجائے اور انسان اُس کو اُتار پھینکنے پر مجبور ہوجائے۔ نہج البلاغہ میں معاشرے کے اسی توازن کو ایک ماڈل کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جہاں "عصمتِ بشری" اور "عصمتِ ملکی" دونوں اقدار بشیرت کو فروغ دے کر پُرامن معاشرے کی تشکیل دے رہے ہیں۔ آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک اور بین الاقوامی ادارے جس طور اور جس سنجیدگی سے انسانی معاشرے کے اخلاقی پہلوؤں پر غور کررہے ہیں اُن کی اہمیت کو تسلیم کررہے ہیں وہ اُن تمام عبرتناک نتائج کا ردِّ عمل ہے جو مادہ پرستی میں ڈوبنے کی بدولت سامنے آئے ہیں۔ جیسے جیسے دنیا مادہ پرستی کے تباہ کُن فسوں سے باہر آئے گی نہج البلاغہ کے ہی سائے میں عافیت پائے گی۔

منابع و مآخذ

نہج البلاغہ: مترجم علامہ مفتی جعفر حسین صاحب، عباس بک ایجنسی، لکھنؤ ۲۰۰۰ء

خطبہ نمبر	۲۸	صفحہ ۱۵۶_۱۵۷
خطبہ نمبر	۳۴	صفحہ ۱۸۵
خطبہ نمبر	۱۰۹	صفحہ ۳۲۱_۳۱۹

عہد نامہ ۵۳ مالک اشتر نخعی کے نام صفحہ ۷۷۰ ـ ۷۴۳

خطبہ	۲۴۳	صفحہ ۵۹۱_۵۹۶
مکتوب	۲۱	صفحہ ۶۶۷
مکتوب	۲۲	صفحہ ۶۶۸
عہد نامہ	۶۷	صفحہ ۷۴۶
وصیت نامہ	۳۱	صفحہ ۶۹۰_۷۱۰
حکم واعظ	۳،۶	صفحہ ۸۰۳
حکم واعظ	۷،۸	۸۰۵
حکم واعظ	۹	۸۰۶
حکم واعظ	۲۰	۸۰۹
حکم واعظ	۱۰۸	۸۳۶
حکم واعظ	۱۱۳	۸۳۸
حکم واعظ	۱۳۷	۸۵۰_۸۵۱

۱- سابق پروفیسر معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۔۲۵

2- Nahju-Balagha A Peak of Eloquence - Translated By S.Ali Raza, Islamic Foundation Press Areekoda Kerala 1990

3- Kitabul Irshad - Shaikh Al Mufid, Translated by I.K.A. Harward, University of Edin Burgh, Ansariyan Publication, Qum, Iran

4- Philosophy of Islam- Behechti - Bahonar, Ansariyan Publication Iran 1990

۵- آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات۔ علامہ سید محمد باقر الصدر طاب ثراہ مترجم علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

۶- عقل و دل۔ شہید مرتضیٰ مطہری۔ توحید۔ جلد ۲، نومبر، دسمبر ۱۹۹۳ء

۷- دانش مسلمین (قسط ۲) محمد رضا حکیمی توحید، جلد ۲ نومبر، دسمبر ۱۹۹۳

۸- حقائق کے بجائے لاالٰہ (عرفان و عمل)، مترنم، کلاسک آرٹ پریس، چاندنی محل، دہلی ۲۰۰۳ء